R No. 2186/57 Regd No A 922

انجمن ترقی اردو ھند کا ھفتہ وار اخبار

ہماری زبان

قیمت تین روپئے سالانہ
ایک پرچہ
دس نئے پیسے
تاریخ اشاعت
(۱۹۶۱-۴-۱)

Telephone No. 26

Telegrams
"ANJUMAN"

جلد ۲۰ ۔ شمارہ ۱۳	ایڈیٹر: آل احمد سرور	علی گڑھ ۔ یکم اپریل ۱۹۶۱ء

ڈاکٹر ثمینہ شوکت

داغ کے کچھ اور شاگرد

داغ اردو کے لافانی شاعروں میں سے ہیں۔ شاعری میں غزل کا اور غزل میں بھی داغ کی غزل کا میدان محدود ہونے کے باوجود اس شاعر سے کتنے لوگوں نے شاعری سیکھی، فن پر عبور حاصل کیا اور زبان کی نزاکتوں کو سمجھنے کے قابل ہوئے، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ہم سے قریب تر زمانے کے شعرائے اردو کے تذکروں میں ان کے بے شمار شاگردوں کا حال ملتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ چنانچہ ان کے ایک حیدرآبادی شاگرد میر محمد علی موسوی رنج کے اردو دیوان "مخبر عشق" کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کے آخر میں داغ کے کئی ایسے شاگردوں کے قطعات تاریخ ملے جن میں سے اکثروں کا حال تذکروں میں نہیں ملتا۔ ان شعراء کی تفصیل ذیل میں درج کی جا رہی ہے۔ اس سے پہلے ایک آدھ لفظ خود میر محمد علی موسوی رنج کے متعلق ——

میر محمد علی موسوی، رنج حیدرآباد کے ایک اچھے شاعر تھے ان کا حال کسی تذکرہ میں درج نہیں ہے۔ رنج میر احمد علی کے فرزند اور میر محمد حسین خان کے پوتے تھے، جو دکن کے مشہور مدار المہام میر عالم کے بھتیجے تھے۔ میر عالم کا نام حیدرآباد میں ان کی تعمیروں کی وجہ سے اب تک زندہ ہے، جن میں میر عالم کا تالاب، میر عالم کی منڈی، میر عالم کی بارہ دری، اور میر عالم گیسٹ ہاؤس اب تک موجود ہیں۔

میر عالم فارسی میں شعر کہتے تھے۔ دکن کی مشہور صاحب دیوان اردو شاعرہ ماہ لقا بائی چندا کو ان سے تلمذ حاصل تھا۔ میر عالم بھی اس کے بڑے قدردان تھے اور اس کے حسن جمال کی تعریف میں انھوں نے ایک فارسی مثنوی "سراپائے ماہ لقا" لکھی تھی۔[1]

رنج، داغ کے اچھے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کے دیوان کا نام "مخبر عشق" خود استاد داغ کا عطیہ ہے۔ یہ تاریخی نام بھی ہے، جس سے ۱۳۱۲ ہجری برآمد ہوتا ہے۔ یہ دیوان مطبع نامی عزیز دکن (چھتہ بازار) حیدرآباد دکن میں طبع ہوا ہے۔ دیوان کل ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، اور اس میں غزلوں کے علاوہ کچھ تاریخی قطعے، رباعیات، مخمسات اور ترجیع بند شامل ہیں۔

"مخبر عشق" پر داغ کے کئی شاگردوں نے تاریخی قطعے لکھے تھے جو اس مطبوعہ دیوان میں شامل ہیں۔ ذیل میں ان شاعروں کی کچھ تفصیل درج کی جاتی ہے:-

میر اکبر علی خاں افسوں، یہ شاہ جہاں پور کے رہنے والے تھے۔ لیکن ملازمت کے تعلق سے بھوپال چلے گئے تھے۔ ان کا ایک قطعہ "مخبر عشق" میں شامل ہے۔

مہدی حسن خاں الم، رنج کے پھوپی زاد بھائی تھے۔ وہ میر محمد حسین کے نواسے تھے، جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ الم نے ڈاکٹری کی تعلیم پائی تھی، لیکن شعر گوئی کا بھی انھیں شغف تھا۔ کبھی کبھی غزل بھی کہتے مگر عموماً مرثیے لکھا کرتے تھے چنانچہ ان کے کئی مرثیے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کے

---

[1] خمخانہ جاوید۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۹۰

ایک مرثیہ کے ترقیمہ سے جو خود انھیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے، یہ پتہ چلتا ہے کہ مرثیہ میں وہ داغ سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۳۲۰ ہجری کے ایک مرثیہ کے ترقیمے سے جس کا مطلع درج ذیل ہے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

یارب زبانِ نظم کو رنگِ قبول دے
ہو جس میں نکہتِ گلِ زہرا وہ پھول دے
آب اس کو آبِ دندانِ سے بہرِ رسول دے
مداح کو شرفِ زوجِ بتول دے
ہر بار تازہ و تر و شیریں ثمر ملے
اس کے صلہ میں گلشنِ جنت میں گھر ملے

ترقیمہ حسب ذیل ہے :-

"در ۱۳۱۹ھ تصنیف نمودم۔ و در شہر محرم ۱۳۲۰ھ از استادی نواب فصیح الملک داغ دہلوی اصلاح گرفتم۔ فقط۔ مرقوم ۲۲ صفر ۱۳۲۰ھ مطابق اردی بہشت ۱۳۲۸ف روز دوشنبہ در قلعہ گولکنڈہ"

مذکورۂ بالا مطلع سے یہ بھی ظاہر ہوگا کہ الم مرثیہ میں انیس کا تتبع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ انیس کے مراثی کی کیفیت اگر ان کے مرثیہ میں نہ ہو، ان کا آہنگ تو پیدا ہو جاتا ہے۔ مرثیے بہت طویل لکھتے تھے۔ ان کے کئی مرثیے سو، سوا سو بندوں کے ہیں۔ قلعہ گولکنڈہ کی طرف اشارہ یہ ہے کہ وہ قلعۂ گولکنڈہ کے ہسپتال میں ڈاکٹر تھے۔

محمد بشیر الدین افسرؔ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ شاعری کے علاوہ انشا پرداز بھی تھے۔ ایک رسالہ "مطلع سخن" کے نام سے نکالتے تھے۔ محکمۂ مال حیدرآباد میں ان کی ملازمت تھی مگر طب میں بھی انھیں درک حاصل تھا۔[۱]

احسان علی خاں احسانؔ رام پور میں ملازم تھے۔ ان کا بھی ایک قطعہ دیوان میں شامل ہے۔

قطب الدین اخگرؔ، قصبۂ جلیسر ضلع ایٹہ ان کا وطن تھا۔ پہلے وہ ذوق کے شاگرد رہے اور بعد میں داغ سے اصلاح لینے لگے تھے۔[۲] ایک قطعہ ان کا بھی شامل ہے۔

مرزا مظفر حسین بیگ بارقؔ، ضلع علی گڑھ ان کا وطن تھا، لیکن حیدرآباد آ گئے تھے اور قلعہ گولکنڈہ کے مدرسہ میں معلم تھے۔ "مخبرِ عشق" میں ان کا قطعۂ تاریخ شامل ہے۔

محمد باقر دہلوی برقؔ، میسور کا ضلع اٹسن ان کا وطن تھا وہ کافی بلامشہر تھے۔[۳]

سید وحید الدین بیخودؔ دہلوی اردو کے مشہور استاد ہیں۔

انھوں نے جو قطعہ لکھا تھا ذیل میں درج ہے :-

حضرت رنجؔ کا چھپا دیوان | ہر مضامیں ہے ان کا قابلِ دید
چشمِ شایق کی آرزو نکلی | دلِ مشتاق کی بر آئی امید
نام روشن ہوا زمانے میں | حضرتِ داغؔ کی جو کی تقلید

بوسرِ جوش سے لکھو بیخودؔ
طبع کا سال ہے فروغِ جدید
۱۳۱۲ھ

محمد یوسف خاں تشنہؔ اور محمد کبیر تفضیلؔ دونوں کے حالات نہیں ملتے۔ صرف قطعات موجود ہیں۔

محمد اعتماد علی خاں حسرتؔ، سعد آباد کے رئیس تھے، اور شاعر کی حیثیت سے تھوڑی بہت شہرت رکھتے تھے۔

حیرتؔ، داغ کے ایک اور شاگرد تھے جن کا نام اور حالات پردۂ خفا میں ہیں۔

محمد مستجاب خاں خلقؔ، حیدرآباد میں محکمۂ کوتوالی میں مہتمم تھے۔ شعر و سخن سے بھی انھیں دل چسپی تھی۔

مہدی حسین علی دلؔ، کے حالات بھی نہیں ملتے۔ صرف ان کا قطعہ تاریخ "مخبرِ عشق" میں شامل ہے۔

میر ابو العلی خاں سلیمؔ، رنج کے بھائی تھے۔ فکرِ شعر کا انھیں بھائی کی طرح شغف تھا۔

نظیر حسین سخاؔ، دہلی کے رہنے والے تھے۔ سخنورانِ دکن کے مرتب نے، انھیں یو۔پی کا باشندہ بتایا ہے جو صحیح بات نہیں ہے۔ وہ حیدرآباد آ گئے تھے اور یہاں دار الترجمہ میں ملازم تھے ان کا انتقال ۱۳۵۲ھ میں ہوا۔ "مخبرِ عشق" میں ان کا ایک قطعہ شامل ہے۔ ذیل میں ان کی ایک غزل کے دو شعر درج کئے جاتے ہیں :-

شیدائے قد و زلف شکن در شکن ہوا
میں کس خطا میں لایقِ دار و رسن ہوا
مجبوریاں تھی کچھ تو نہ کی ورنہ کیوں
کانٹوں سے پھول باغ میں ہم انجمن ہوا

غلام سرور سرورؔ، حیدرآباد کے باشندے تھے اور وکالت کا پیشہ انجام دیتے تھے۔ کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے۔

بدن خاں بہادر شہرتؔ، ان کے حالات کا بھی پتہ نہیں چلتا صرف ان کا تاریخی قطعہ دستیاب ہوا ہے۔

شہزادہ مرزا منیر الدین ضیاؔ، شہزادہ مرزا رحیم الدین حیا کے فرزند تھے اور دہلی ان کا وطن تھا۔ لیکن اوائل عمر میں حیدرآباد آ گئے تھے اور یہیں ان کا قیام آخر تک رہا۔ سدہ محاسبی حیدرآباد میں وہ ملازم تھے۔ عروض سے انھیں بڑی دل چسپی تھی چنانچہ اس پر انھوں نے ایک رسالہ "تحقیقاتِ ضیا" کے نام سے لکھ کر شائع کیا تھا۔ غزل میں ان کا انداز منجھا ہوا تھا۔ ذیل میں ان کے دو شعر نقل کئے جاتے ہیں :-

کوئی گلِ رنگ خوش رو منچیوں میں ہو گیا شامل
مثالِ آفتاب اب چمکے گی تقدیرِ مے خانہ

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

۱؎ خمخانۂ جاوید ج ۱ صفحہ ۳۰۳
۲؎ " " " ۲۱۲ و ۲۱۳
۳؎ " " " ۵۲۰

ہماری زبان

یکم اپریل سنہ ۱۹۶۱ء

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے (اقبال)

ہم سے کل ایک دوست نے جو ایک مشہور افسانہ نگار ہیں، بڑے بھلے آدمی ہیں اور اپنی سنجیدگی اور خلوص کی وجہ سے یگانۂ روزگار مانے جاتے ہیں، باتوں باتوں میں سوال کیا کہ اردو کا ہندوستان میں کیا مستقبل ہے؟ یہ سوال ہم سے بارہا کیا گیا ہے اور ہم نے اپنی بساط کے مطابق اس کا جواب ہماری زبان کے صفحات پر بھی کئی دفعہ دیا ہے۔ اپنے دوست کو بھی ہم نے اسی طرح جواب دیا اور بظاہر وہ مطمئن ہو گئے۔ گو وہ مطمئن نہ ہوتے تو بھی اخلاقاً کہتے نہیں، مگر ہم اس واقعہ کے بعد سے اپنے آپ سے یہ سوال برابر کرتے رہے ہیں اور جو جواب پاتے رہے ہیں اس میں ہماری زبان کے پڑھنے والوں کو شریک کرنا چاہتے ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ ہم نجومی نہیں ہیں اور غیب کا حال نہیں جانتے۔ ہمیں نہیں معلوم کل کیا ہونے والا ہے، مگر ہم حال کے علم سے، اپنے اور دوسروں کے تجربات سے، واقعات کے رشتوں سے، حالات کے تجزیے سے، ان میلانات کا کچھ اندازہ تو لگا ہی سکتے ہیں جو ابھر رہے ہیں اور جو مستقبل پر اس طرح اثر انداز ہو سکتے ہیں کہ اس کی عام شکل متعین کریں۔ ایسے تجزیے میں ہماری یہ کوشش ضرور ہونی چاہیے کہ ہم خواہش کو حقیقت نہ سمجھ لیں، مستثنیات کو اصول نہ بنائیں، چند مثالوں پر حکم نہ لگائیں اور جس حد تک ممکن ہو سکتا ہے معروضی نظر پیدا کریں۔

معروضی نظر ہمیں بتاتی ہے کہ نئے ہندوستان میں ایک طرف منزل کی کوشش ہے، دوسری طرف راہ کے کانٹے ہیں۔ منزل کی کوشش ہیں آگے بڑھاتی ہے راہ کے کانٹے کبھی بیٹھ جانے اور کبھی تکلیف کے غالب آ جانے کی وجہ سے منزل سے مایوس ہونے کی دھوپ چھاؤں پیش کرتے ہیں۔ ہماری منزل ایک ایسا سماج ہے جس میں مذہب کا فرق، دولت کا فرق، زبان اور علاقے کا فرق نہ ہو اور سب ملک کی خدمت کا برابر حق ادا کریں اور اس کی برکتوں سے برابر فائدہ اٹھائیں۔ راہ کے کانٹے پرانے تعصبات ہیں اور نئے نظام کے دئے ہوئے وہ حقوق ہیں جنہیں ذمے داری سے برتنا ہمیں ابھی نہیں آیا۔ اس وجہ سے نئے نظام سے بیزار ہونا غلط ہے اس کو سلیقے سے برتنا ضروری ہے۔

اُردو کا مستقبل، ہندوستان میں قومیت، منصفانہ سماج، جمہوریت اور غیر مذہبی ریاست کے تصورات کے حقیقت بن جانے پر منحصر ہے۔ مکمل حقیقت نہ سہی عمومی حقیقت سہی۔ ابھی یہ عمومی حقیقت بھی وجود میں نہیں آئی ہماری اس کی طرف توجہ ضرور ہے اور یہ توجہ ایک نیک شگون ہے۔ تصورات میں بڑی طاقت ہوتی ہے، مگر صرف تصور سے تصویر نہیں بنتی اس کے لئے فنکار کو رنگوں، خطوط اور بساط کے قوانین سے واقف ہونا پڑتا ہے۔ کیمیا بنانا ممکن ہے بشرطیکہ اجزا مناسب ہوں، ہم اب تک ناقص اجزا سے کیمیا بنانے کی کوشش میں لگے رہے ہیں، ہماری اکثریت ابھی اس تعلیم سے بے بہرہ ہے جو عقل کو جلا دے اور تہذیب سے کام لینا سکھائے۔ وہ ایک طرف صدیوں کی غلامی کی وجہ سے اپنی مظلومیت اور دوسروں کی بربریت کی قائل ہو گئی ہے، دوسرے وہ حقوق حاصل کرنا سیکھ گئی ہے، ذمے داریوں سے بچنا جانتی ہے، تیسرے احتجاجی سیاست نے اسے نمائشی چیزوں کا عادی بنا دیا ہے۔ وہ کام کرنے سے زیادہ اپنی صلاحیتوں کا ڈھنڈورا پیٹنا ضروری سمجھتی ہے، وہ معرکے کو نہیں فتح و شکست کو دیکھتی ہے کھیل کے آداب کا نہیں، ہار جیت کا رعب مانتی ہے۔ وہ قوم پرستی کا نام لیتی ہے مگر اقلیتوں کے حقوق کو نظر انداز کرتی ہے، وہ جمہوریت کے معنی صرف اکثریت کے ڈنڈے کے لیتی ہے، وہ ادب کی سرپرستی کا اعلان کرتی ہے تاکہ ادیب سرکاری اور دفتری نظام کا پرزہ ہو جائیں، وہ اپنی زبان کی کامیابی صرف اس میں سمجھتی ہے کہ وہ کسی علاقے کی سرکاری زبان ہو جائے اور دوسری زبان والوں کو لازمی طور پر سکھائی جائے۔ تصور میں کوئی خرابی نہیں، مگر تصویر بنانے میں مصالحہ کیسا لگ رہا ہے، اسے نہ بھولیے۔

ہمارا کہنا یہ ہے کہ زبان کا مسئلہ ہو یا علاقے کا یا تعلیم کا یا معیارِ زندگی کا۔ ان میں سے کسی کو ملک کی فلاح کے مجموعی تصور سے علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو کا مستقبل، ہندوستان میں قومیت، جمہوریت سماجی انصاف اور غیر مذہبی ریاست کے مستقبل سے وابستہ ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ایسی ریاست بن جانے پر یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا یہ مسئلہ زبان، تعلیم، معیارِ زندگی ہر دائرے کا حق ادا کرنے سے حل کی طرف بڑھے گا۔ انقلاب کے آنے کے انتظار میں آج دروازے پر یہ تختی کام نہیں دے گی،

انقلاب آئے تو ہم کو بھی خبر کر دینا

یہ انقلاب تو روزمرہ زندگی میں، ہر سوال کا مناسب جواب دینے، ہر گوشے کا خیال رکھنے، ہر پہلو کی طرف توجہ کرنے سے آئے گا۔ اور جب آئے گا تو شاید تصویر تصور سے پھر بھی مختلف ہو گی، مگر اس میں تصور کی توانائی اور تازگی جلوہ گر ضرور ہو گی۔ اُردو کو بھی اس کا حق ملے گا، شاید ان معنی میں نہیں جن میں ہم چاہتے ہیں اور کئی معنی میں اس سے زیادہ جو ہمارے خواب و خیال میں ہے۔ ہاں اس حق کے ملنے سے فائدہ شاید ہم کو نہ پہنچے گا۔ ہمارے بعد آنے والے اس سے بہرہ مند ہوں گے۔ مگر باغبان جو پودا لگاتا ہے اس کا پھل اُسی کو کب ملتا ہے اور کیا وہ صرف اپنے لئے ہی پودا لگاتا ہے۔

اُردو کی تحریک نئے ہندوستان کے تصور کو تصویر بنانے کا ایک پہلو ہے اور اہم پہلو۔ مشترک تہذیب کی جیتی جاگتی حقیقت کو جو لوگ پرچھائیوں کے عشق میں بدلنا چاہتے ہیں، وہ اُردو کے ساتھ کیسے انصاف کریں گے۔ مگر مشترک تہذیب کے تصور پر تو ساری تعمیر قائم ہے۔ اسے فروغ دینا ہے اور سب کو اس کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا ہے۔ اس کوشش کی کامیابی کے امکانات بھی روشن ہیں، مگر اس کے لئے عمل شرط ہے۔ اس عمل کی تفصیل اگلی اشاعت میں ملاحظہ کیجئے۔ (باقی)

اِدھر اُدھر سے

اُردو میں سائنس کے اوّلین کارنامے

ترقّیِ اُردو بورڈ پاکستان کا ایک سہ ماہی رسالہ جوش ملیح آبادی کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ یہ اُردو کی ادبی دنیا میں ایک وقیع اضافہ ہے اس میں عنوان بالا سے ایک مضمون خواجہ حمید الدین شاہد نے لکھا ہے۔ جس کے ایک ٹکڑے کا اقتباس نیچے دیا جا رہا ہے: —————— (ہماری زبان)

"اُردو میں سائنسی ادب" کا موضوع اتنا قدیم اور اہم ہے کہ اس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن اب تک اس کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ حالانکہ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل اُردو میں سائنس کی کتابوں کی تالیف اور ترجمے کا کام آغاز ہو چکا تھا۔ چنانچہ ریاضی، کیمیا، طبیعیات، حیاتیات، طب اور ہیئت پر اتنی زیادہ کتابیں لکھی گئیں کہ اگر ان سب پر سرسری طور پر بھی لکھا جائے تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ بڑی تحقیق اور تلاش کے باوجود ڈیڑھ سو سال سے پہلے کی سائنس کی کوئی اُردو کتاب دستیاب نہیں ہو سکی۔ اُردو زبان میں سائنس کی سب سے قدیم کتاب "بحرِ حکمت" ہے جو ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۹ء عیسوی میں لکھنؤ کے مطبع "سبحانی" میں طبع ہوئی تھی۔ یہ کتاب (۱۰ × ½۶) انچ کی تقطیع کے (۸۰) صفحات پر مشتمل ہے اور لکھنؤ میں چھپی ہے۔ مشہور ماہرِ تعلیم جناب سجاد مرزا صاحب، سابق معتمد تعلیمات سلطنتِ آصفیہ، حیدرآباد، جنھوں نے فنِ طباعت کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے، مجھ سے اس امر کا انکشاف کیا تھا کہ "بحرِ حکمت" سب سے پہلی اُردو کتاب ہے جو لکھنؤ پریس میں چھپی ہے۔ اس لحاظ سے اس کتاب کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ "بحرِ حکمت" پادری پرکنس صاحب کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ پوری کتاب میں کسی صفحہ پر کہیں بھی مترجم کا نام درج نہیں ہے۔

ہندستانی کی مقبولیت

محمد جعفر تھانیسری کی خود نوشت داستان "ابتلا" ۱۸۶۴ء "چٹان" لاہور میں قسط وار چھپ رہی ہے۔ محمد جعفر تھانیسری ۱۸۶۴ء کی دارو گیر میں وہابی تحریک کے جرم میں گرفتار ہو کر قید کاٹنے انڈمان بھیج دیے گئے تھے۔ انھوں نے ۱۸۷۹ء میں اپنی داستان لکھی تھی جس کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا یہ ہے:

پورٹ بلیر ایک ایسی جگہ ہے کہ جہاں چینی، برمی، ملائی، سنگلی، جنگلی، نکوباری، کشمیری، پشتونی، ایرانی، مکرانی، عربی، حبشی، پارسی، پرتگیز، امریکن، انگریز، ڈین، فرنچ وغیرہ اور ہندستان کے سب ضلعوں اور شہروں کے آدمی مثل بھوٹانی، نیپالی، پنجابی، سندھی، گجراتی، دیس والے ہندوستانی، اہلِ برج، آسامی، مسلکی، بندیل کھنڈی، اڑیا، تلنگی، مرہٹے، کرناٹکی، مدراسی، ملیالم، گونڈ، بھیل، بنگالی، کول، سنتھال وغیرہ موجود ہیں۔ جب یہ لوگ آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو اپنی اپنی زبان میں بات چیت کرتے ہیں مگر بازار اور کچہریوں کی زبان یہاں بھی ہندوستانی ہے۔ ہر ملک کا آدمی یہاں آ کر آپ سے آپ ہندوستانی زبان سیکھ لیتا ہے کیونکہ اس زبان کے جانے بغیر یہاں آدمی کا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ میرے خیال میں بر روئے زمین پر کوئی دوسرا مقام ایسی مختلف قوموں سے آباد نہ ہوگا۔ قریب چالیس مختلف قوموں کے جو ایک دوسرے کی زبان نہ سمجھ سکیں یہاں موجود ہیں۔ شانِ الٰہی سے یہاں ایک ایسا میلہ جمع ہوا ہے کہ شاید آج تک بر روئے زمین پر ایسا مجمع کہیں نہ جمع ہوا ہوگا۔

عبد الرزاق سمرقندی کا سفرنامۂ ہند

عبد الرزاق سمرقندی کی کتاب سفرنامۂ ہند کا فارسی زبان سے ازبیک زبان میں ترجمہ شائع ہو گیا ہے۔ عبد الرزاق سمرقندی (۱۴۱۳ تا ۱۴۸۲ء) پندرہویں صدی کے مشہور اہلِ قلم تھے جنھیں دربارِ ہرات نے سفارتی فرائض کے لئے ہندستان بھیجا تھا۔ شاہ رخ کے سفیر کی حیثیت سے انھوں نے جنوبی ہند کا دورہ کیا تھا اور یہ کتاب اس سفر کی داستان ہے۔

ازبیک علماء سمرقندی کی اس کتاب کو علم الہند کے لئے بہت اہم اور ضروری سمجھتے ہیں۔ عبد الرزاق نے اس سفرنامے میں بہت دلچسپ معلومات جمع کر دی ہیں اس نے بیجاپور کے ایک میلے کا ذکر کیا ہے کہ اس میلے میں تین تین چار چار سو میل کی مسافت سے لوگ آتے ہیں اور یہاں چار پانچ منزل تک کی عمارتیں ہوتی ہیں۔ جس عمارت میں راجہ فروکش ہوتے تھے، وہ نو منزلہ عمارت تھی۔ خود عبد الرزاق کو اس عمارت کی ساتویں منزل میں جگہ ملی تھی۔ میلے میں بڑی گہما گہمی تھی۔ قسم قسم کے کھیل تماشے اور کرتب دکھائے جاتے تھے۔ جابجا خوبصورت کوٹھیں بنی ہوئی تھیں، بعض کوٹھیں ہر وقت گھومتی رہتی تھیں۔ ہول کا یہ عالم تھا کہ دولت ابلی پڑتی تھی۔

بچّوں کے رسائل کے مدیران کی کانفرنس

بچّوں کے رسائل کے ایڈیٹروں کا پہلا بین الاقوامی سیمینار پراگ (روس) میں حال ہی میں منعقد ہوا۔ اس میں عوامی جمہوریتوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔

سیمینار میں دنیا کے تمام ترقی پسند اخبار نویسوں کے نام ایک اپیل منظور ہوئی جس میں آواز دی گئی ہے کہ بچّوں پر قتل اور غارتگری کے جاسوسی ناولوں کا جو بُرا اثر پڑ رہا ہے اس کا مقابلہ کریں۔ سیمینار میں فیصلہ ہوا کہ ان ملکوں کے بچّوں کے ادب کے اشاعت گھر ایک دوسرے سے اور ربط بڑھائیں۔

دانش فرازی

ایک لمحہ

ایک لمحے کی بھلا عمر ہی کیا
نفسِ آمد و شد کے مانند
کبھی مہجور تو گاہے خورسند
قطرۂ اشکِ مسرت کی طرح
آہِ سرگشتۂ حسرت کی طرح
ہاتھ آئی ہوئی اک دولتِ عیش
دفعتاً جیسے بچھڑ جاتی ہے
جیسے ٹوٹے ہوئے سپنے کی مانگ
ظلمتِ شب میں اجڑ جاتی ہے
پاس یوں آیا، رُکا اور چلا
ہم اسی سوچ میں ہیں
ایک لمحہ ہے کراں تا بہ کراں
اس کی آغوش میں کتنے طوفاں
روز چپکے سے جنم لیتے ہیں
اسی لمحے میں فرامینِ جہاں
ہاتھ میں دامنِ تقدیرِ امم لیتے ہیں
بستیاں بس کے اُجڑ جاتی ہیں
وسعتیں آپ سُکڑ جاتی ہیں
فیصلے ہوتے ہیں تقدیروں کے
حلقے کٹ جاتے ہیں زنجیروں کے
بڑھتے ہیں تند ہواؤں کے سفیر
کانپ جاتا ہے زمانے کا ضمیر
اسی لمحے کے مہک سائے ہیں
کتنے منصوبے نمو پاتے ہیں
فاصلے کتنے سمٹ جاتے ہیں
زندگی ڈال کے تاروں پہ کمند
اسی لمحے کہیں ہوتی ہے بلند
کوئی قیمت ہی نہیں اپنے وطن میں اسکی
کوئی آواز نہیں اپنے چمن میں اسکی

انور بھوپالی

غزل

شبہہ اگر تمہیں آدم کی داستاں میں نہیں
تو پھر گناہ کوئی سجدۂ بتاں میں نہیں
ترے نثار مرا حال پوچھنے والے
ترے کرم سے کوئی فرق دردِ جاں میں نہیں
ہمیں نے خونِ تمنا سے اس میں رنگ بھرا
ہمارا نام کہیں پوری داستاں میں نہیں
جبیں پہ اب بھی تڑپتی ہے آرزوئے سجود
مگر کشش ہی کسی سنگِ آستاں میں نہیں

وارث کرمانی

غزل

سوالِ شوق بھی ہے شوقِ ناگوار بھی ہے
عجیب شوخ طبیعت نگاہِ یار بھی ہے
جنوں کی فصل میں کیا ضبطِ شوق کی تاکید
یہ پوچھیے کہ ہمیں دل پہ اعتبار بھی ہے
صبا کے دوش پہ آتے ہیں شاخِ گل کے سلام
خزاں میں شائبۂ قربتِ بہار بھی ہے
ہم اُس سے کیا گلۂ سوزِ غم کریں ہمدم
یہ غم اُسی کے تصور سے خوشگوار بھی ہے
ہجومِ عارض و گیسو میں کوئی شے گم ہے
اب اختلاط کے عالم میں انتظار بھی ہے
ہمیں کو خون رُلاتی ہے ورنہ اے ناصح
وہ چشمِ ناز محبت کی پاسدار بھی ہے
ہماری چھیڑ بتوں سے یونہی نہیں وارث
کچھ اپنی حُسن پرستی پہ اعتبار بھی ہے

نصیر پرواز

غزل

آنکھ چھلک چھلک اُٹھی یاد جدھر جدھر گئی
روح بہک بہک اُٹھی نبض ٹھہر ٹھہر گئی
داغِ جگر جلے جلے جیسے کنول کھلے کھلے
شمع بھڑک بھڑک اُٹھی صبح ٹھہر ٹھہر گئی
نشۂ اضطراب تو چھوڑ گئی گھٹا گھٹا
بزم مہک مہک اُٹھی زلف بکھر بکھر گئی
دستِ حنا کے آفتاب عارضِ لالہ کے ماہتاب
صبح دمک دمک اُٹھی شام نکھر نکھر گئی
رسمِ وفا کی بات بھی ہجر کی واردات تھی
زیست لپک لپک اُٹھی رات سنور سنور گئی
زلف کمر کی داستاں پھیل گئی زباں زباں
شاخ لچک لچک اُٹھی موج بکھر بکھر گئی
کوئی بھی منزلِ سکوں پا نہ سکا مرا جنوں
پربت بھٹک بھٹک اُٹھی راہ جدھر جدھر گئی

سہدیو پرشاد بسمل

غزل

دوائے دردِ عشق ہے، کبھی ہوا ہے یوں کہیں؟
کرشمہ لبوں کی "ہاں" بھی بن گئی "نہیں نہیں"
یہ سجدہ ہائے عشق ہیں کہ بارِ غم سے سر جھکے
تمہیں کہو بتائیں کیا جھکی ہوئی ہے کیوں جبیں
وہ وصل بھی فراق تھا وہ دید بھی فریب تھی
میں خود سے دور دور تھا وہ آئے جب قریں قریں
نہ وصل سے بھی بجھ سکی مرے طلب کی تشنگی
شریکِ بزمِ ناز تھا یہ دل مگر حزیں حزیں
کشاں کشاں چلے ہیں ہم نئے جہان ڈھونڈتے
حریفِ چشمِ شوق ہے نہ آسماں نہ یہ زمیں

انجمن کا خبرنامہ

انجمن ترقی اُردو مظفرپور کی تشکیل

ریاستی انجمن ترقی اُردو بہار کی ہدایت پر انجمن ترقی اُردو مظفرپور کی جدید تشکیل زیر نگرانی مولوی محمد ادریس صاحب میونسپل کمشنر جوائنٹ سکریٹری ریاستی انجمن ترقی اُردو بہار عمل میں آئی۔ اتفاق رائے سے مندرجہ ذیل حضرات انجمن مظفرپور کی شاخ کے عہدہ دار تین سال کے لئے منتخب ہوئے :-

صدر : جناب امرناتھ چوپڑا ایم۔ اے منیجر پنجاب نیشنل بنک مظفرپور۔

نائبین صدر : مولوی سید افتخار احمد وکیل مولوی انظار احمد کرمی وکیل۔ مولوی محمد احسن وکیل۔ مولوی سید حمید نواب۔

جنرل سکریٹری : سید داؤد احمد مالک بجارت میڈیکل ہال مظفرپور۔

جوائنٹ سکریٹری : اصغر حسین اعجازی (جرنلسٹ) وکیل۔ سید شمیم کاظمی۔ سید شاہ برکت اللہ۔ اظہر الحسن۔

پروپیگنڈا سکریٹری : محمد عارف تاجر۔ مولوی محمد کریم بخش تاجر۔ مولوی محمد یوسف تاجر۔

آفس سکریٹری : حکیم شہاب ابراہیمی خازن۔ حاجی عبدالسلام۔

ممبران مجلس منتظمہ : سید ذکی حسن خاں۔ ڈاکٹر مغفور احمد اعجازی۔ ڈاکٹر سید منصور احمد۔ ڈاکٹر سید زین العابدین۔ مولانا اختر الزماں رحمانی۔ محمد ادریس صاحب میونسپل کمشنر۔ محمد اسمٰعیل صاحب میونسپل کمشنر۔ عبدالواجد صاحب تاجر چرم۔ رسول بخش صاحب ٹھیکہ دار۔ منشی عبدالحکیم صاحب تاجر غلہ۔ مولانا غریب الحسن۔ عبدالسبحان بیڑی تاجر۔ مولانا سید محمد عباس۔ سید نقی حسن۔ مولوی نجم الہدیٰ کنٹریکٹر۔ منشی محمد علی حسن۔ ڈاکٹر عبدالوحید شوق۔ حافظ احمد سجاد صاحب۔ مولوی غلام محمد صاحب کنٹریکٹر۔

(حکیم شہاب ابراہیمی۔ آفس سکریٹری)

نصیر آباد لائبریری کا اجراء

یہ خبر اہل ادب کو سُن کر خوشی ہوگی کہ میں نے اپنے قصبہ نصیر آباد ضلع رائے بریلی (اودھ) میں ایک لائبریری ۲ فروری سنہ ۱۹۶۷ء کو قائم کی ہے۔ جس میں حق شناس افراد میری مکانی امداد فرما رہے ہیں۔ جناب راجہ مہندر پرشاد صاحب تریان پیشوائی دھملی نے جو ہمت افزائی کی ہے وہ صد شکریہ کے قابل ہے۔

(خادم نظیر مہدی)

اہم علوم کی کتابیں

پارلیمنٹ میں سائنٹفک اور کلچرل امور کی وزارت کے رقمی مطالبات پر بحث کرتے ہوئے نائب وزیر ڈاکٹر من موہن نے بتایا کہ ریاستی حکومتوں سے کہا گیا ہے کہ وہ ایک پانچ سالہ پروگرام بنائیں تاکہ ہندستان کی تمام بڑی زبانوں میں اہم علوم سے متعلق کتابیں شایع کی جاسکیں۔

انڈیا آفس لائبریری

وزیر ثقافت اور سائنسی تحقیق مسٹر ہمایوں کبیر نے اپنے شعبہ کے مطالبات پر بحث کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ انڈیا آفس لائبریری کی واپسی کے معاملے میں بات چیت آگے بڑھ رہی ہے مگر اس مسئلے کے حل ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔

تحریک آزادی کی تاریخ

پارلیمنٹ میں بجٹ کے دوران ہندستان کی تحریک آزادی کی تاریخ کے مواد و لہجہ پر عام طور پر ممبروں نے بے اطمینانی کا اظہار کیا۔ یہ کتاب وزارت ثقافت اور سائنسی تحقیق نے شایع کی ہے۔ بعض ممبروں نے اسے واپس لے لینے کا مشورہ دیا۔ وزیر متعلقہ نے معاملے کی تفصیل میں جانے سے گریز کرتے ہوئے صرف یہ جواب دیا کہ کتاب کے مصنف ڈاکٹر تارا چند ہندستان کے چند بڑے مورخوں میں سے ایک ہیں۔

اُردو ادب کا تازہ شمارہ

اردو ادب سہ ماہی جلد ۹ شمارہ ۱ و ۲ (مشترکہ) شایع ہوگیا ہے۔ یہ شمارہ کئی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ سالانہ قیمت دس روپے (علاوہ محصول ڈاک) ہے۔ فی شمارہ دو روپے پچاس نئے پیسے۔
اس شمارے کی قیمت پانچ روپے ہے
فہرست مضامین حسب ذیل ہے

۱۔ سید سلیمان ندوی اور ان کے چند خطوط	ڈاکٹر عبداللہ چغتائی
۲۔ غالب کے دو نادر خطوط	امیر حسن نورانی
۳۔ دیوان سید شاہ حسینی بیجاپوری	سخاوت مرزا
۴۔ کشمیری زبان کے لئے ایک رسم الخط	حیات اللہ انصاری
۵۔ حالی اور نیا تنقیدی شعور	اختر انصاری
۶۔ کلام غالب کا انتخاب جو خود غالب نے کیا	حبیب احمد صدیقی
۷۔ دیوان ناظم میں غالب کا حصہ	اکبر علی خاں
۸۔ جدید اُردو تنقید	عبدالمغنی
۹۔ نقشے کی ادبیانہ حیثیت	حسن الاسیم
۱۰۔ اُردو افعال	غلام ربانی
۱۱۔ پیام ساوتری	محمد اسمٰعیل
۱۲۔ بغاوت کے اخبارات	محمد عتیق صدیقی
۱۳۔ مولوی احمد اللہ شاہ	شفقت رضوی

گنڈا یا غنڈا؟ املا کیا ہو؟

عام طور سے اخباروں میں غنڈا لکھا جاتا ہے اور بولنے والے بھی اسی طرح بولتے ہیں لیکن قومی آواز میں گنڈا لکھا جاتا ہے۔ اب لوگ پوچھ رہے ہیں کہ ہم نے املا کیوں بدل دیا ہے، اور یہ کہ گنڈا وہی لفظ ہے جسے غنڈا لکھا جاتا ہے یا کوئی اور لفظ ہے۔

نور اللغات میں اگر آپ لفظ غنڈا دیکھیں تو یہ عبارت ملے گی غنڈا۔ فارسی میں غنڈ۔ غنڈہ صفت۔ ایک جگہ جمع کیا ہوا یا وہ گرد کسی کے جمع ہو۔

ہندی میں گنڈا بمعنی لچا، مذکر۔ لچا۔ شہدا۔ اگر آپ اسی لغت میں لفظ گنڈا دیکھیں تو یہ معنی لیں گے۔ گنڈا۔ (ہندی) صفت مذکر۔ لچا۔ شہدا۔ بدمعاش۔ مونث کے لئے گنڈی۔

اصل لفظ گنڈا ہے اور آج سے پندرہ بیس سال پہلے اسی طرح استعمال ہوتا تھا۔ پھر یہ غین سے لکھا جانے لگا اور رفتہ رفتہ اس کے معنی بھی لچا، شہدا، بدمعاش سے مختلف ہو گئے مثلاً فسادوں میں حصہ لینے والے، لوٹ مار کرنے والے کو غنڈے کہتے ہیں، اور وہاں لچے، شہدے یا بدمعاش کے الفاظ استعمال کرنا صحیح نہ ہوگا۔

ہم نے اب تک اس لفظ کو صحیح املا کے ساتھ لکھا اور اس کو برقرار رکھنا چاہا۔ یہ ہندی لفظ ہے اس کو غین سے لکھنا مناسب نظر نہیں آیا لیکن اب ہم دیکھتے ہیں کہ غلط املا اور تلفظ کے ساتھ یہ لفظ اتنا چلی نکلا ہے کہ اکثر ہندی میں بھی گا سے لکھ کر اس پر بندی لگا دی جاتی ہے یعنی غلط لفظ نے صحیح لفظ کو شکست دے دی ہے۔

اصولاً ہم اس بات کو پسند نہیں کرتے ہیں کہ ہندی اور اُردو میں جو الفاظ مشترک ہیں، ان کا تلفظ یا املا اُردو میں بدلا جائے۔ دوسری طرف یہ بات بھی ہے کہ ہم اصولاً مستعمل غلط لفظ کو نامانوس صحیح لفظ پہ ترجیح دیتے ہیں۔ اب سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ غنڈا کو کس طرح استعمال کریں یہاں پہلے اور دوسرے اصولوں میں ٹکر ہو رہی ہے کیونکہ لفظ غنڈا اتنا استعمال ہوتا ہے کہ خود لکھنؤ کے لوگ ہم سے پوچھتے ہیں کہ گنڈا کے کیا معنی ہیں۔ اور کچھ تو اس کو زیر کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ ان حالات میں ہم سخت تذبذب کے شکار ہیں کہ اس کا املا گ سے رکھیں یا غین سے۔ کیا زبان سے دل چسپی رکھنے والے حضرات اس معاملے میں کوئی مشورہ دیں گے؟

رائے:- معاصر قومی آواز نے لفظ "غنڈا" کی تحقیق چاہی ہے ہماری رائے میں نور اللغات میں غنڈ اور غنڈہ بھی غلط چھپا ہے فارسی میں ڈ نہیں ہے۔ غند کے جو معنی ہیں وہ غنڈے کے مطلب سے میل نہیں کھاتے، غیاث اور دوسری لغتوں میں بھی غند کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ غنڈے کے لئے لوگوں کو جمع کرنا ضروری نہیں ہے۔ یہ ذات شریف بذات خود ایک ٹولی ہیں۔ وہ تنہا بھی خنجر اور چاقو چلاتے، خواتین سے چھیڑ چھاڑ کرنے اور فتنے بیدار کرنے میں طاق ہوتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ اکثر غنڈے اپنی ایک جماعت رکھتے ہیں ممکن ہے یہ لفظ "گنڈہ" رہا ہو۔ پنجاب میں بڑی باتیں پھیلانے کو اب بھی گند پھیلانا کہتے ہیں۔

بہر صورت اس کی اصل قریب گنڈا ہندی ہے، لیکن اُردو ہندی میں عام طور پر غنڈے کا چلن ہے، چلن کی بڑی اہمیت ہے۔ ذرا غور کیا جائے تو غنڈے کی صوتی ہیئت میں معنی کا مفہوم اور زور زیادہ واضح ہوتا ہے، غنڈے کو اس کی اصل (گنڈے) کی طرف لوٹایا جائے تو کوئی اصلاح نہ ہوگی غنڈا ہی رہے گا اس لئے چلن کو ترجیح دینا مناسب ہے۔

(ہماری زبان)

پنجاب میں اُردو کتاب پر پہلا انعام

اب تک حکومت پنجاب ہندی اور پنجابی کی کتابوں اور ان زبانوں کی اشاعت پر بیش بہا رقم صرف کرتی رہی ہے، اس سال بھی ہزار ہزار کے کئی انعام ان زبانوں کی کتابوں پر دئے گئے ہیں۔ اُردو کہتی ہی رہی۔

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

مگر شنوائی نہ ہوئی تھی۔

اب کی اُردو کی بھی شنوائی ہوئی ہے، اُردو کے مشہور ادیب حضرت لبھو رام جوش کو ۱۰۰ روپے اور ایک خلعت ملی ہے یہ پہلا انعام ہے جس سے اُردو والوں کو نوازا گیا ہے۔

اُردو ایجنڈے کے لئے جن سنگھ کی وکالت

دلی کارپوریشن میں ایک مسئلے پر بحث کے دوران جن سنگھ نے بڑی شد و مد سے اعتراض کیا کہ ایجنڈا صرف ہندی اور انگریزی میں اراکین کو بھیجا گیا ہے اُردو میں بھی بھیجنا ضروری تھا اس لئے اس مسئلے پر آج بحث نہیں ہو سکتی۔ کمیونسٹ اور بعض دیگر ممبروں نے چاہا کہ ایک ضابطے کی بات پر خواہ مخواہ معاملات کے طے ہونے میں دیر نہ کی جائے، بحث ہو جائے تو کوئی حرج نہیں اگر ممبر انگریزی نہیں، تو ہندی جانتے ہی ہیں کام چل سکتا ہے مگر اس سلسلے میں یہ انکشاف ہوا کہ دو ممبر مسٹر کرشنا لال اور مسٹر حکومت رائے بھوٹانی صرف اُردو ہی جانتے ہیں۔ آخر کار صدر کارپوریشن شیام ناتھ صاحب کو جن سنگھ کے پوائنٹ آف آرڈر کو تسلیم کر کے معاملہ دوسرے روز پر ملتوی کرنا پڑا۔

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا جام ہے
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

ضروری اعلان

براہ مہربانی خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے

مراسلات

عمر خیام کی شاعری

رسالہ اسلامک ورلڈ۔ لندن۔ جلد اول نمبر ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۶۰ء میں عراق کے ایک عالم عبدالحق فاضل نے عمر خیام کی شاعری پر محققانہ مقالہ لکھا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ گو عمر خیام کے ہمعصر سمرقندی، زمخشاری اور بیہقی نے رباعیات کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ عمر خیام شاعری سے بے حس تھا۔ بیہقی جس نے زیادہ تفصیلی حالات لکھے ہیں اس سے بھی فروگزاشتیں ہوئی ہیں مثلاً عمر خیام کی مستند کتاب جبر و مقابلہ کا اس نے ذکر نہیں کیا ہے حالانکہ یہ وہ تصنیف ہے جو عمر خیام کی ابن سینا پر برتری ثابت کرتی ہے۔ مختصراً یہ استدلال کیا ہے کہ اپنی زندگی میں عمر خیام علم ہندسہ اور دیگر علوم کے لئے مشہور تھا اور اپنی وفات کے بعد جب کہ سائنسی علوم میں غیر معمولی ترقی ہوگئی اس کی رباعیات کی شہرت اور قدر ہونے لگی۔ عمر خیام کی رباعیات کے اُجاگر کرنے میں غیر ملک کے عالموں کا بڑا حصہ ہے۔

اسی رسالہ میں عمر خیام کی رباعیات کے نئے ایڈیشن اور فرینچ ترجمہ پر تفصیلی ریویو ہے۔ صفحہ (۳۱۴) یہ ترجمہ پی آر پاسکل نے کیا ہے جو روما میں ایرانی سفارت خانہ کے چانسلر ہیں۔ پیرس اور کیمبرج (انگلستان) کے قلمی نسخوں کے چربے بھی اس میں شامل ہیں۔ اس مصور ایڈیشن کی قیمت تقریباً پچھتر روپیہ ہے جس سے اسکی نوعیت ظاہر ہوتی ہے۔

(سجاد مرزا)

پرچھائیں

اس کے تلفظ پر بحث آپڑی ہے۔ میرا کہنا ہے اس کا لہجہ آئین (اصول) یا سائیں (سادھو) جیسا ہے اور ان صاحب کا (جو مجھ سے بحث پر تلے ہوئے ہیں) کہنا ہے کہ نہیں بلکہ دائیں اور بائیں کی طرح پرچھائیں صحیح ہے۔ اب بتائیے میں غلط سمجھ رہی ہوں یا ان کا کہنا ٹھیک ہے۔ ریاض کا شعر ہے ؎

کہاں بجلی میں یہ بیتابیاں تھیں ● دل مضطر کی پرچھائیں پڑی ہے

اور براہ کرم یہ بھی بتائیں کہ یہ کس کا شعر ہے ؎

کیا ہے اس قدر تیرا تصور تیرے وحشی نے
کہ پرچھائیں نظر آنے لگی دیوار زنداں پر

نیز یہ بھی بتائیے کہ اس لفظ کی جمع "پرچھائیاں" ہوگی یا صرف پرچھائیں سے کافی ہے۔

واحد و جمع دونوں کے لئے ایک ہی لفظ۔ ۱۲

(جہاں بانو نقوی)

گل بکاولی

ہماری زبان یکم مارچ ۱۹۶۰ء و یکم اپریل ۶۰ء میں جناب سراج دھولپوری صاحب جناب سید مسعود حسن رضوی صاحب نے گل بکاولی کے متعلق چند باتیں تحریر فرمائی تھیں، یہ چند سطور اسی سے متعلق ہیں۔ امرکنٹک میں "مائی کی بگیا" ایک اُجڑا ہوا باغ ہے جہاں گل بکاولی اب بھی دستیاب ہے۔ نرمدا ندی اور ریاست بہار میں بہنے والی سون ندی امرکنٹک سے ہی نکلی ہیں۔ امرکنٹک ایک پُرفضا مقام ہے۔ مدھیہ پردیش کی تین کمشنریوں جبل پور (ضلع منڈلا)، بلاسپور (ضلع بلاسپور) اور ریواں کمشنری (ضلع سہڈول) کی سرحدیں یہاں ملتی ہیں۔

حال ہی میں حکومت مدھیہ پردیش نے امرکنٹک سے متعلق ایک مختصر سا معلوماتی لٹریچر شائع کیا ہے۔ گو یہ لٹریچر مشکل ہندی میں ہے لیکن اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ "اردو ادب میں گل بکاولی کو خاص شہرت حاصل ہے"۔ مائی کی بگیا میں "گل بکاولی" پھولتے ہیں۔ پھولوں سے نکالا ہوا عرق آنکھوں کے لئے مفید ہوتا ہے"۔ چند سال پیشتر امرکنٹک کی سیر کرنے کا اتفاق ہوا تھا اُس وقت گل بکاولی کے متعلق کوئی بات ذہن میں نہ تھی۔ اب کبھی سیر کا اتفاق ہوگا تو انشاءاللہ گل بکاولی کو دیکھنے اور بکاولی کے محل کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔

(مقصود احمد مکی۔ بلاسپور)

تبصرے

از ضیاء احمد بدایونی

(۱) و (۲) تجلیات مدینہ - تمہارے اسلاف اور تم

از مولانا نسیم بستوی صاحب۔
ملنے کا پتہ۔ مکتبہ لطیفیہ۔ براؤن شریف۔ پوسٹ آفس سکھوئی۔ ضلع بستی۔ قیمت ۶ نئے پیسے فی کتابچہ۔

اول الذکر نعتیہ غزلوں اور سلاموں کا مجموعہ ہے اور ثانی الذکر میں ملت اسلامیہ کی تصویر کے دو رُخ (ماضی و حال) بصورت مسدس پیش کئے گئے ہیں۔ مصنف ایک عالم دین ہیں اور شاعری میں مولانا ضیاء القادری بدایونی (نزیل کراچی) سے جو ملک کے مشہور نعت گو استاد ہیں تلمذ رکھتے ہیں۔ ان کتابچوں میں مصنف نے احتیاط و ادب کی رعایت کرتے ہوئے حضور رسالتمآبؐ میں اپنے جذبات محبت و عقیدت پیش کئے ہیں۔ نیز قوم کو اس کا شاندار ماضی یاد دلا کر اصلاح حال کی نصیحت کی ہے۔

اشعار میں کہیں کہیں زبان و بیان کی کمزوریاں نظر آئیں مثلاً۔ ہو پوری تمنائے دیدار طیبہ۔ جدائی ہے دل پر گراں دیکھتے ہیں۔ (تجلیات ص۔۱) یہاں ردیف بیکار ہے۔ یاد حضورؐ کی یاد آتی ہے ہر دم۔ نہاں دل میں درد نہاں دیکھتے ہیں (ایضاً) ایک نہاں زائد ہے۔ اللہ غنی مصحف رخسار محمدؐ۔ اللہ کو محبوب ہے کردار محمدؐ۔ دونوں مصرعوں میں کوئی ربط نہیں۔ (ص ۱۱) اسی طرح چین و قرار۔ رنگت گلزار (ایضاً) یہ ترکیبیں بھی درست نہیں۔ ص ۱۹ پر صد رشک حسین۔ ص ۲۲ پر جب شہ خوبان عالم سکراتے ہیں حضور۔ نیز۔ لیکن ہم عاصی کو دامن میں چھپاتے ہیں حضور (عین کا گرنا اور عاصیوں کی جگہ عاصی لانا) بھی محل نظر ہیں۔ تمہاری ذات گرامی سے جو ملے ہم کو۔ وہی حسین سہارے سلام کہتے ہیں۔ کوئی بات نہ ہوئی۔

"تمہارے اسلاف اور تم" میں بھی سچے جذبات کے ساتھ روانی پائی جاتی ہے۔ مگر بعض جگہ قافیوں کے استعمال میں بے احتیاطی ہے مثلاً بھرتے ہیں اور کہتے ہیں (ص ۱۳) اسی کے ساتھ موقع بموقع مخالف فرقوں پر مطاعن نہ ہوتے تو بہتر تھا۔

(۳) مقالات و نعتیہ کلام

مرتبہ ایم طاہر صاحب جنرل سکریٹری مسلم یوتھ ایسوسی ایشن بھوپال۔
ناشر مسلم یوتھ ایسوسی ایشن۔ رفیقیہ اسکول روڈ۔ بھوپال۔
قیمت ۶۲ ن پ۔

آج کل جبکہ ہمارے نوجوان لایعنی بلکہ مخرب اخلاق تحریکات و تفریحات کی رو میں بے اختیار بہے چلے جا رہے ہیں قابل مبارکباد ہیں مسلم نوجوانان بھوپال جنھوں نے مسلم یوتھ ایسوسی ایشن قائم کی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ قوم کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کیا جائے اور اسلام کے نظام حیات کا مطالعہ کرکے اسلامی اقدار کو شعر و ادب کے ذریعے سے دوسروں تک پہنچایا جائے۔

زیر نظر رسالہ مذکورہ ایسوسی ایشن کی پیش کش ہے جس میں تین مقالے اور متعدد نعتیہ نظمیں شامل ہیں۔ "اسلامی اقدار کا مد و جزر" اور "عرب کا ایک ستارہ" بہت پُر از معلومات، بصیرت افروز اور دلچسپ مقالے ہیں۔ نظمیں یا غزلیں جو چند پختہ مشق اور بیشتر نوجوان شعراء کے نتائج فکر ہیں عموماً جوش عقیدت اور نیز شعری لطافت کی آئینہ دار ہیں۔ امید ہے کہ اہل ذوق رسالہ مذکورہ کی قدر کریں گے اور حتی الامکان اس کی نشر و اشاعت میں مدد دیں گے۔

اسی کے ساتھ ارکان ایسوسی ایشن کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نعت کے دوران میں حق تعالیٰ کے لئے ایسے الفاظ "فدا" (خدا بھی تو خود ہے فدائے محمدؐ) نیز "شیدائی" "جاں نثار" قطعاً ناروا ہیں۔ علیٰ ہذا

احد اور احمدؐ میں حائل ہے پردہ۔ نگاہ ادب سے اٹھائے محمدؐ

اس قبیل کے اشعار سے بھی اجتناب لازم ہے۔ کیا اچھا ہو کہ اس طرح کے علمی و ادبی حلقے ہر بڑے شہر میں قائم ہوں جن کے ذریعہ سے سنجیدہ تعمیری ادب کی آواز گھر گھر پہنچ سکے۔

(۴) چیستان کلیم حصہ اول

از کلیم شولاپوری۔
ملنے کا پتا۔ دار الکلام۔ نمبر ۶۴۳ جمعہ پیٹھ۔ شولاپور۔
قیمت ۲۵ ن پ۔

پہیلی بچوں کی ذہانت تیز کرنے اور معلومات بڑھانے کا اچھا ذریعہ ہے۔ نہ صرف بچے۔ بلکہ بڑی عمر والے بھی پہیلیوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ ایک سنسکرت لفظ प्रहेलिका سے مشتق ہے اسی کو عربی میں لغز۔ فارسی میں چیستاں اور انگریزی میں enigma کہتے ہیں۔ لغز اصل میں چوہے کے سوراخ کے لئے مستعمل ہے جو بہت پیچ در پیچ ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے پہیلی کو یہ نام دیا گیا۔ شاید کوئی قوم اور ادب ایسا نہیں جس میں پہیلی کا وجود نہ ہو۔ اردو میں امیر خسرو سے پہلے پہیلی کا سراغ نہیں ملتا۔ زیر نظر کتابچہ کلیم صاحب کی خود ساختہ پہیلیوں پر مشتمل ہے۔ پہیلی نہ تو اس قدر آسان ہو کہ بے تامل اس کا جواب ذہن میں آ جائے نہ اتنی دشوار ہو کہ دیر تک غور کرنے پر بھی جواب نہ سوجھے نہ مبہم ہو کہ ایک سے زیادہ جوابات پر صادق آئے۔ اس مجموعے میں ہر قسم کی پہیلیاں ہیں اور آخر میں ان کے حل دے دئے گئے ہیں۔ تاہم ان کے دلچسپ اور مفید ہونے میں شبہ نہیں۔ ہمارا تجربہ ہے کہ بچے ان کو بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ امید ہے کہ کلیم صاحب آئندہ مشہور اور خود ساختہ دونوں قسم کی پہیلیاں شائع کریں گے جن میں بچوں کی عمر و استعداد کی مناسبت سے مختلف حصے بہ تدریج دقیق ہوتے جائیں۔

شبیر احمد غوری

اقبال کا نظریہ زماں

اُردو ادب پر اقبال کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے اُردو ادب کو زمان و مکان وغیرہ جیسے دقیق اور غامض تصورات کی خشک اور دلچسپ ابحاث سے روشناس کرایا۔ "خودی" کے تصور کے علاوہ جسے اقبال کے مخصوص نظام فکر میں کلیدی حیثیت حاصل ہے، جن بنیادی مسئلوں پر انھوں نے غور کیا ہے ان میں زمان و مکان کا سائنسی اور فلسفیانہ مسئلہ بھی شامل ہے۔ ان کا خیال تھا کہ زمان و مکان کا مسئلہ مسلمانوں کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے:۔

"دوسری طرف اسلامی تہذیب کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خالص ذہنی مسائل ہوں یا مذہبی نفسیات یعنی اعلیٰ تصوف کے مسائل، سب کا نصب العین اور مقصود یہی ہے کہ لامحدود کو محدود کے اندر سمو لیا جائے۔ ظاہر ہے جس تہذیب کا مطمح نظر یہ ہو اس میں زمان و مکان کا سوال در حقیقت زندگی اور موت کا سوال ہے"

(الٰہیات اسلامی کی تشکیل جدید صفحہ ۲۰۰)

اس لطیف اور غامض مسئلے کے سلسلے میں اقبال نے جو کچھ کہا ہے اسے دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(ل) شاعرانہ خیالات اور (ب) سنجیدہ علمی افکار۔

جہاں تک ان کے شاعرانہ خیالات کا تعلق ہے تو وہ شعریت کا پہلو زیادہ لئے ہوئے ہیں، اُن پر غور و فکر سے زیادہ "جذبہ" کا غلبہ ہے اور اس لئے ان کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ان کے "سنجیدہ خیالات" ہیں۔ اقبال کے "منظوم افادات" سے زمانے کے جو تصورات مستنبط ہوتے ہیں ان میں بڑا اضطراب ہے بلکہ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ باہم گردست و گریباں ہیں۔ اگر ان پر "توحید الوہیت" کا جذبہ غالب ہو جاتا ہے تو وہ انتہا پسند متکلمین کی ہمنوائی میں زمان و مکان ہی کے منکر ہو جاتے ہیں اور طبیعیین و فلاسفہ کی تمام فکری سرگرمیوں کو جو انھوں نے "حقیقت زمانہ" کی توضیح کے سلسلے میں انجام دی ہیں، شرک اور زنار پوشی سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔ ؎

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا اِلٰہ اِلّا اللہ

اور جب کائنات کی وسعتوں کے مقابلے میں انسان اور اُس کی مساعی ہیچ و پوچ نظر آتی ہیں تو پھر یہی "موہوم زمانہ" ان کے خیال میں موثر حقیقی بن جاتا ہے اور اس وقت اقبال فلاسفہ اسلام کی ڈھکی چھپی زمانہ پرستی اور ازلیت زمان کی تعلیم کو بھی پیچھے چھوڑ کر عرب جاہلیت کی "دہریہ پرستی" تک پہنچ جاتے ہیں۔ ؎

سلسلۂ روز و شب "نقش گر حادثات"
سلسلۂ روز و شب "اصل حیات و ممات"

غالباً زمانہ کے موثر بالذات ہونے کا اعتراف "نقش گر حادثات" سے زیادہ مصرح الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح زمانے کی ازلیت و ابدیت کے باب میں فرماتے ہیں ؎

وقت "اکو" اول و آخر ندید　　از خیابان ضمیر اد مید

"روح اقبال" کے مصنف نے اقبال کے "تصور زماں" کی توضیح میں لکھا ہے (صفحہ ۳۳۷):۔

"اقبال نے اپنی نظم "نوائے وقت" میں زماں کے مختلف پہلوؤں کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے، زمانہ انسان کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے.... میں تمام عالم پر محیط ہوں ...... میں فنا کے گھاٹ بھی اتارتا ہوں اور اپنے سر چشموں سے حیات جاوداں بھی عطا کرتا ہوں، قوموں کا عروج و زوال مجھ سے ہے...... غرضکہ حیات و کائنات کی ساری ہنگامہ آرائیاں میرے ایک اشارۂ ابرو کا نتیجہ ہیں"

ظاہر ہے ان دونوں خیالات میں یعنی ایک جگہ زمان و مکان کا سرے سے انکار اور دوسری جگہ سلسلۂ روز و شب کے نقش گر حادثات ہونے کا اعتراف، دونوں میں بعد المشرقین ہے اور یہ تناقض کسی سنجیدہ تفکیر کی ہم آہنگی کا نتیجہ نہیں ہو سکتا لہٰذا اس اضطراب فکر کے بعد ان کے تصور زماں کے باب میں اُن کے اشعار سے استشہاد زیادہ مفید نہ ہوگا۔

لیکن "مطالعۂ اقبالیات" کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ان کے معتقدین ایک فلسفی مفکر کے بجائے ان کے مفکر اسلام ہونے پر زور دیتے ہیں اور ان کے تمام آراء و افکار کو اسلامی اور قرآنی الاصل بتاتے ہیں جیسا کہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے "روح اقبال" کے مقدمہ (صفحہ ز) میں لکھا ہے:۔

"ان کی تمام تعلیم شروع سے آخر تک اسلامی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے کیونکہ اسلامی اثر اُن کی رگ رگ میں سرایت کر چکا تھا............اقبال کا کلام شاعرانہ پیرایہ بیان اور جدید علوم کی روشنی میں سراسر قرآن کریم کی تشریح ہے۔ اگر مثنوی رومؔ کو آٹھ سو برس قبل "قرآن در زبان پہلوی" سمجھا گیا تھا تو ہم کلام اقبال کو بھی اس الف ثانی میں وہی رتبہ دے سکتے ہیں"

بلکہ جہاں تک "حقیقت زمان" کی توضیح کا تعلق ہے خود علامہ اقبال کا بھی اپنے متعلق یہی خیال تھا کہ زمانہ اور تقدیر کے سلسلے میں اسلام کے نقطۂ نظر (جس کی صحیح توجیہ سے ان کے خیال میں تمام سابق مفکرین ناکام رہے تھے) انھوں نے ہی صحیح تعبیر فرمائی ہے چنانچہ خطبات (بحوالہ روح اقبال ص۲۲۳) میں فرماتے ہیں :-

"زمانہ کو جب ایک عضوی کل کی حیثیت سے دیکھا جائے تو قرآن کی زبان میں اس کو تقدیر کہتے ہیں لفظ تقدیر کی مسلمانوں کے ہاں اور غیر مسلموں میں بھی بالکل غلط تعبیر پیش کی گئی ہے۔ تقدیر زمانہ ہی کی ایک شکل ہے............زمانہ کو جب تقدیر خیال کیا جاتا ہے تو وہ ماہیت اشیاء بن جاتا ہے"

مگر اقبال محض فلسفی تھے، مورخ نہیں تھے۔ یہ تو صرف ماہرین تاریخ کا کام تھا کہ وہ اقبال کے محررہ بالا دعویٰ کی تحقیق کرتے۔ لیکن مورخین عہد سے "روح اقبال" کے مصنف نے اقبال کے اس قول کو جس طرح نقل کیا ہے اس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ اس کی تصدیق فرما رہے ہیں اور یہ دعویٰ بحث و نظر سے بلند تر واقع ہوا ہے۔

مگر مسئلہ اتنا سلجھا ہوا نہیں ہے۔ بدقسمتی سے علامہ نے جس خیال کو قرآن حکیم کی تعلیم سمجھا ہے وہ قرآن حکیم کی تعلیم نہیں ہے (بلکہ غالباً اس کی ضد ہے) علامہ کی اس زمانہ (۲۸ - ۱۹۳۴ء) کی زندگی جب وہ خطبات کی ترتیب، پیش کش اور نظر ثانی میں مصروف تھے، اس بات کی شاہد ہے کہ زمانہ کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر سے واقف ہونے کی مخلصانہ کوشش کے باوجود وہ اپنی اس خواہش میں ناکام ہی رہے۔

خیر یہ تو علیحدہ مسئلہ ہے۔ غالباً صورت حال یہ تھی کہ علامہ جتنے عرصہ جرمنی میں رہے "Metaphysics of Persia" کی ترتیب و تحریر کے سلسلے میں جرمن مستشرقین سے ایران قدیم کے "زروانی خیالات" سننے کا انھیں اتفاق ہوتا رہا۔ ان میں سے بہت سی "زروانی تعلیمات" اُن کے لاشعور میں جمع ہوتی رہیں۔ آخر عمر میں جب اُن پر "اسلام فہمی" کا جذبہ شوق غالب ہوا تو قرآن حکیم کے مطالعہ کے دوران میں یکایک ان میں سے بہت سے زروانی خیالات کسی لطیف اور پیچیدہ نفسیاتی عمل کے تحت لاشعور سے شعور میں القا ہونے لگے اور علامہ نے کچھ ایسا محسوس کیا کہ پہلی مرتبہ ان پر یہ انکشاف ہو رہا ہے کہ :-

"لفظ تقدیر کی اسلام کے اندر اور باہر بالکل غلط تعبیر کی گئی ہے (ورنہ) تقدیر زمانہ ہی کا نام ہے جبکہ اس کے امکانات سے قبل اس پر نظر ڈالی جائے"

سردست یہ محض قیاس آرائی ہے جس کی تائید و تشدید اور اسی طرح تضعیف و تردید کی بہر حال گنجائش ہے۔ مگر کم از کم اتنا واقعہ ضرور ہے کہ زمانے کے جس تصور کو وہ "اسلامی الاصل" سمجھتے تھے وہ ایرانی الاصل ہے۔ اس کی تائید اس بات سے اور ہوتی ہے کہ جاوید نامہ میں اقبال نے جہاں اپنے آسمانی سفر کے آغاز کا ذکر کیا ہے، وہاں زمان و مکان کی روح "زروان" سے ملاقات کا حال بیان کیا ہے کہ وہ کس طرح حیات اور تقدیر کے اسرار شاعر پر کھول دیتی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ سارا جہان میرے (روح زمان کے) طلسم میں اسیر ہے۔ ~~

بستۂ ہر تدبیر با تقدیر من — ناطق و صامت ہمہ نخچیر من
من حیات من ممات من نشور — من حساب دوزخ و فردوس حور
آدم و افرشتہ در بند من است — عالم شش روزہ فرزند من است

ہر گلے کز شاخ می چینی منم
ام ہر چیز سے کز می بینی منم

اور یہ تمام خیالات غیر اسلامی بلکہ مشرکانہ و دہر پرستانہ ہیں۔ علامہ اقبال کے یہ منظوم و منثور افادات کہاں تک صحیح ہیں اس کا فیصلہ صرف محققین فلسفہ ہی فرما سکتے ہیں لیکن ان کا خیال کہ یہ اسلامی الاصل بھی ہیں ضرور محل نظر ہے۔

بقیہ: داغ کے کچھ اور شاگرد

ہمیشہ بے خود ہوں مری کیفیت ایسی ہے
کہ گھر میں بُت تو ہے خانہ میں اک تصویرِ خانہ

"مخبرِ عشق" کے لئے انھوں نے جو قطعہ لکھا ہے وہ حسبِ ذیل ہے :-

لکھا ہے رنج نے دیوان اپنا اس قدر اچھا
جسے عشاق کا مرغوب محبوبوں کا پیارا ہے
عیاں ہے شستگی الفاظ کی مضمون کی بندش
بلاغت جلوہ افگن ہے فصاحت جلوہ آرا ہے
یہ تنہائی کا مونس ہے یہ دل چسپی مجلس
طبیعت کے بہلنے کا غرض پورا سہارا ہے
ہوئی تاریخ کی جب فکر ہاتف نے کہا مجھ سے
ضیا لکھ راحت آگیں رنج کا دیوان سارا ہے

ضیا کے مذکورۂ بالا قطعہ تاریخ کے علاوہ ایک اور قطعہ بھی دیوان میں شامل ہے۔

خاقان حسین عارف دہلوی : کے حالات بھی نہیں معلوم ہوسکے اور دیوان میں مندرجہ قطعہ کے علاوہ کچھ اور کلام بھی دستیاب نہیں ہوسکا۔

محمد عماد الدین چشتی القادری، عالم : ان کے بارے میں صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یہ امروہہ کے رہنے والے تھے۔ کلام کا نمونہ سوائے قطعہ تاریخ کے دستیاب نہیں ہوا۔

محمد فیروز شاہ خاں، فیروز : ان کا وطن رامپور تھا۔ کلام دستیاب نہیں ہوسکا۔

قادر حسین قادر : قادر کا وطن حیدرآباد تھا۔ اس قطعہ کے علاوہ جو دیوان میں شامل ہے ان کا کچھ اور کلام بھی دستیاب ہوتا ہے۔ ذیل میں ان کے دو شعر نقل کئے جاتے ہیں :-

لالہ ہوا گلاب ہوا نسترن ہوا
اک ایک داغ رشکِ بہارِ چمن ہوا
خنجر سے نوک جھونک ہے ابروں سے چھیڑ چھاڑ
کب تو کسی کا اے بتِ پیماں شکن ہوا

ممتاز احمد صدیقی ممتاز : تھانہ کے باشندے تھے اور ریاست جونا گڑھ میں نائب میر منشی کے عہدے پر مامور تھے۔ انھوں نے آنحضرت کی مدح میں ایک رسالہ بھی لکھا تھا جو "فتح برکات فی النعت سید الموجودات" کے نام سے موسوم ہے۔ اس قطعہ کے علاوہ جو "مخبرِ عشق" میں شامل ہے، ان کا کچھ کلام دستیاب نہیں ہوا۔

برہان علی شاہ مخمور : حیدرآباد کے باشندے اور اچھے شاعر تھے۔ قطعہ درج ذیل ہے :-

طبعِ رنگین رنج صاحب کا ● بے خزاں داد کیا کھلا ہے چمن
لکھ سرِ ابتہاج سے یہ سال
ہو گیا طبعِ عشق کا مخزن

برہان الدین نگین : کے حالات معلوم نہ ہوسکے اور سوائے ایک قطعہ تاریخ کے کچھ کلام بھی دستیاب نہ ہوسکا۔

عبد الصمد واصفی : حیدرآباد کے باشندے تھے اور شاعری میں انھیں اچھی مشق تھی۔ ان کی ولادت ۱۸۵۵ء میں ہوئی تھی۔ ذیل میں ان کے دو شعر منقول ہیں :-

وہ بیقرار ہوں مجھ کو کریں گے دفن جہاں
تو زلزلے میں رہے گی وہ سرزمیں برسوں
لے کے تم جس کو ملا کرتے ہو بے دردی سے
وہ نہیں غنچۂ گل دل ہے تمنائی کا

سید محمد اصغر حسین واقف : یہ لاڈلے صاحب کے نام سے مشہور تھے ان کے مزید حالات اور کلام دستیاب نہیں ہوسکا۔

"مخبرِ عشق" کے مصنف میر محمد علی موسوی نے داغ سے متعلق بھی کچھ تاریخیں لکھی تھیں جو دیوان میں شامل ہیں۔ ایک تاریخ "مہتابِ داغ" کی طباعت کی ہے جو حسبِ ذیل ہے :-

چھپا جب کہ استاد کا میرے دیوان
جلے مدعی خوش ہوئے دوست احباب
لکھ اے رنج یوں با دلِ شاد تاریخ
یہ دیوان بھی ہے داغ صاحب کا نایاب
۱۳۱۰ھ

داغ کو سرکار نظام میر محبوب علی خاں کے دربار سے "جہاں استاد" کا خطاب عطا کئے جانے کے موقع پر بھی رنج نے ایک قطعہ کہا تھا جو ذیل میں درج کیا جارہا ہے :-

خدا نے آج وہ رتبہ عطا کیا تم کو
ہر شخص کیوں نہ ہو پھر رنج اس حال میں شاد
کہی ہے با سرا خلاص عیسوی تاریخ
خطاب تم کو مبارک ہو یہ جہاں استاد

داغ کو سرکار نظام کی طرف سے رہنے کے لئے ایک مکان عطا ہوا تھا اس موقع پر بھی رنج نے ایک تاریخی قطعہ لکھا تھا، جس میں "دیا حضور نے گھر" سے ۱۳۱۵ ہجری نکالا ہے۔

استاد داغ نے بھی "مخبرِ عشق" کی تاریخ کہی تھی جس میں انھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ "مخبرِ عشق" کا نام ان کا دیا ہوا ہے۔ قطعہ درج ذیل ہے :-

حضرتِ رنج کا چھپا دیوان ● جسکے دیکھے سے دل ہوا پر عشق
اس کی لے داغ ہے یہی تاریخ ● نام رکھا ہے ہم نے "مخبرِ عشق"

پبلشر نذیر حسن پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا